© rasailojaraid.com

مولانا عبید اللہ سندھی

ایک تبصرہ پر تبصرہ

(۲)

از مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی۔ ایم۔اے

جہاں تک مولانا کے افکار کا تعلق ہے، جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے۔ مجموعی طور پر وہ قرآن مجید حضرت شاہ ولی اللہؒ کی تصانیف اور مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی کتابوں سے ماخوذ ہیں۔ لیکن اس کے باوجود بعض طبقوں میں ان سے جو توحش پایا جاتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم لوگ متعدد اسباب دوجوہ کی بنا پر قرآن مجید کو ایک خاص انداز سے ہی سمجھنے کے عادی ہو گئے ہیں۔

اب رہیں شاہ صاحبؒ کی تصنیفات تو ان کا حال یہ ہے کہ اگرچہ آج شاید کوئی ہی مسلمان ہو جو حجۃ اللہ البالغہ کے نام سے نا آشنا ہو، لیکن حق یہ ہے کہ طبقۂ علماء میں بھی آپ کو بہت کم ایسے افراد ملیں گے جنھوں نے شاہ صاحبؒ کی دوسری تصانیف کا تو ذکر ہی کیا ہے، حجۃ اللہ کو بھی از اول تا آخر سمجھ کر اور غور و فکر کے ساتھ پڑھا ہو۔ ورنہ واقعہ یہ ہے کہ اگر ہمارے علماء شاہ صاحبؒ کی تمام کتابوں کو پڑھیں اور حجۃ اللہ البالغہ کے ان ابواب کے علاوہ جو عبادات اور ان کے اسرار و حکم سے متعلق ہیں ان ابواب کا بھی بغور مطالعہ کریں جن میں اسلام کے اصول شرائع اور بنیادی مسائل پر گفتگو ہو گئی ہے تو اس کا لازمی نتیجہ اس کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا کہ یا تو وہ اپنے اس محدود فکر کو چھوڑنے پر آمادہ ہو جائیں گے جس کی بنا پر مولانا عبید اللہ سندھی ایسے مفکر اسلام ان کی آنکھوں میں خار کی طرح کھٹکتے ہیں۔ اور یا ان کے دل میں حضرت شاہ صاحبؒ کے متعلق بھی وہی جذبات پیدا ہوں گے جو وہ آج مولانا سندھی کی نسبت اپنے نہاں خانۂ قلب میں محسوس کرتے ہیں اور چونکہ مولانا ان کے معاصر ہیں اس لئے زبان سے ان جذبات کا بیباکانہ اظہار بھی کر دیتے ہیں۔

میں نے یہ جو کچھ کہا ہے محض دعویٰ نہیں بلکہ ایک حقیقتِ ثابتہ ہے اور اب آئندہ آپ جو کچھ ملاحظہ فرمائیں گے اس میں آپ کو اس دعویٰ کے ہی شواہد و نظائر بکثرت ملیں گے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہندوستانی قومیت | جناب ناقد نے مولانا سندھی کے افکار کا جو باریک خط کے چار سو صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں خلاصہ یہ بتایا ہے کہ

"مولانا سندھی اسلام اور ہندوستانی قومیت کا ایک معجون مرکب پیش کرنا چاہتے ہیں تاکہ ہندوؤں کو اسلام سے وحشت نہ رہے اور مسلمان بھی خوشی خوشی ہندوستانی قومیت کا جزو بن سکیں۔" (ص ۱۷۳)

اس سلسلہ میں گذارش یہ ہے کہ معلوم نہیں جناب ناقد کی مراد "ہندوستانی قومیت" سے کیا ہے؟ اگر مراد یہ ہے کہ مولانا متحدہ قومیت کے قائل ہیں اور وہ دو قوموں کو ایک دوسرے میں مدغم کر کے ایک قوم بنانا چاہتے ہیں تو واقعہ یہ ہے کہ مولانا کی مراد یہ ہرگز نہیں ہے۔ مولانا نے اس کتاب میں متعدد مواقع پر یہ ظاہر کیا ہے کہ وہ مسلمانوں کا قومی وجود الگ اور منفرد تسلیم کرتے ہیں، چنانچہ وحدتِ انسانیت کے باوجود آپ انسانوں کی قومی اور گروہی تقسیم کو ناگزیر بتاتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں۔

"انسانوں کا، قوموں، گروہوں اور افراد میں بٹا ہونا وحدت انسانیت کے منافی نظر نہیں آتا" . . . . فرد ایک مستقل اکائی ہی ہے، جماعت ایک اکائی ہے جو افراد پر مشتمل ہے اس طرح ایک قوم اپنی جگہ مستقل وجود رکھتی ہے۔" (ص ۸۱)

پھر گاندھی جی کے نظریۂ متحدہ قومیت پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"گاندھی جی غلطی سے یہ سمجھ بیٹھے کہ وہ ہندوستان کو ہزار ہا سال پہلے کی جون میں بدلنے میں کامیاب ہو جائیں گے انھوں نے اس کا مطلق خیال نہ کیا کہ ۸۰۰ برس سے ایک اور قوم، ایک اور زبان، ایک نیا تمدن اور ایک نیا فکر اس وطن کو اپنا گھر بنا چکا ہے اور اس سرزمین پر اس کا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا کہ گاندھی جی کی قوم ان کی زبان کلچر اور فلسفہ کا ہے۔" (ص ۳۶۳)

آگے چل کر اسی صفحہ پر مسلمانوں کے حق حکومت خود اختیاری کو واجب اور درست بتاتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"دو چیزیں بہت اہم تھیں جن کو نئے ہندوستان میں جگہ دینا بیحد ضروری تھا۔ ان میں سے ایک تو جمہوریت یعنی خود اپنی مرضی اور اپنی رائے سے اپنے اوپر حکومت کرنے کا حق ہے۔"

اقتباساتِ بالا سے یہ ظاہر ہے کہ مولانا "متحدہ قومیت" کے نظریہ کو صحیح تسلیم نہیں کرتے۔ البتہ جیسا کہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آج کل ہر بالغ نظر ہندوستانی خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان محسوس کرتا ہے، مولانا یہ ضرور سمجھتے ہیں کہ جب تک ہندوستان کی یہ دونوں بڑی قومیں کسی ایک محاذ پر جمع نہیں ہوں گی ان کے سیاسی اور وطنی مسائل کی گتھی نہیں سلجھ سکیگی۔ اس مشترکہ محاذ کا نام مولانا "ہندوستانی قومیت" رکھتے ہیں جس کو ہم آجکل کی سیاسی اصطلاح میں دفاعی قومیت بھی کہہ سکتے ہیں۔ ارباب منطق کے عام مقولہ "لامشاحۃ فی الاصطلاح" کے مطابق آپ اس کو ہندوستانی قومیت کہئے یا دفاعی قومیت سے اسے تعبیر کیجئے بہر حال اس کا مفاد اس سے زیادہ نہیں ہے کہ ہندو اور مسلمان باوجود اس ملک کی الگ الگ دو قوموں میں منقسم ہونے کے بہر حال ایک ملکی اور وطنی اشتراک رکھتے ہیں اور اس اشتراک کی بنا پر اس ملک اور وطن کا جو مطالبہ ہندوؤں سے ہے وہی مسلمانوں سے بھی ہے اور انہیں اس مطالبہ کا جواب دینا چاہئے۔ مولانا اس مقصد کے لئے جیسا کہ جناب ناقد نے لکھا ہے "اسلام اور ہندوستانی قومیت کا ایک معجون مرکب" بنانا نہیں چاہتے ہیں بلکہ ان کا منشا یہ ہے کہ

"ہندو اور مسلمان دونوں ملکر کام کریں اور ان کی صرف ایک سیاسی تنظیم ہو لیکن اس سیاسی تنظیم میں کسی مذہبی گروہ کا غلبہ نہ ہو" (ص ۳۶۲)

فقرہ کے آخری الفاظ خاص توجہ کے مستحق ہیں جن کا مطلب یہ ہے کہ دونوں قوموں کا مذہب الگ الگ رہیگا۔ اور اس مشترک تنظیم کی نوعیت محض سیاسی ہوگی۔ یعنی اندرون ملک امن و امان قائم رکھنا، صنعت و حرفت کی ترقی۔ ذرائع آمد و رفت اور رسل و رسائل کی تیاری اور ان کا انتظام بیرونی حملہ سے حفاظت کے اسباب وغیرہ ان چیزوں میں دونوں قوموں کا اشتراک ہوگا اور بس۔ مذہبی غلبہ کسی کا نہیں ہوگا۔ اس سے بعض تبلیغی جوش رکھنے والے مسلمانوں کو تکدر ہو سکتا ہے۔ لیکن سوچنے اور غور کرنے کی بات یہ ہے کہ ہندو تعداد کے اعتبار سے مسلمانوں سے کہیں زیادہ ہیں۔ اس بنا پر اگر آپ ان سے یہ شرط منواتے ہیں کہ مرکزی وفاق میں مذہبی غلبہ کسی کا نہیں ہوگا تو خود سوچئے اس میں زیادہ بھلا کس کا ہے؟ ہندوؤں کا یا مسلمانوں کا؟ اسی پیش بینی کی بنا پر مولانا نے یہ شرط لگائی ہے۔

غالباً ہمارے فاضل نقاد ان مسلمانوں میں سے ہیں جو آجکل "وطنیت" کے نام سے کسی مسئلہ پر غور کرنا پسند ہی نہیں کرتے۔ جی تو ہمارا بھی یہی چاہتا ہے کہ اے کاش ہمارے معاملات میں وطنیت کا قدم درمیان میں آتا ہی نہیں اور ہم اس قابل ہوتے کہ جو بات سوچیں عالم اسلام کا ایک جزء ہونے کی حیثیت سے ہی سوچیں۔ لیکن۔

یُرِیْدُ الْمَرْءُ اَنْ یُّعْطٰی مُنَاہُ ؛ وَیَاْبَی اللّٰہُ اِلَّا مَا یَشَاءُ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس وقت مسلمانانِ ہند کی جو حالت ہے وہ یہ ہے کہ تقریباً تمام اسلامی ممالک سے ان کا رشتہ منقطع ہو چکا ہے اور اب کوئی جگہ ایسی نظر نہیں آتی جو اس عالم یاس و تاریکی میں ان کے شکستہ دلوں کے لئے مومیائی کا کام دے۔ اس بنا پر اب انھیں جو کچھ کرنا ہے ہندوستانی مسلمان کی حیثیت سے کرنا اور یہاں کی دوسری قوموں کے ساتھ مل کر ہی اپنی حالت کو سدھارنا ہے۔

اس بحث پر بہت کچھ لکھنے کو جی چاہتا ہے لیکن افسوس یہ ہے کہ گنجائش بالکل نہیں۔ البتہ اس قدر گذارش کر دینا اور ضروری ہے کہ مولانا سندھی کے متعلق جیسا کہ جناب ناقد نے بھی ظاہر کیا ہے بعض لوگوں کا تاثر یہ ہے کہ مولانا اسلام سے ہندوؤں کی وحشت کو دور کرنے کے لئے ایسی باتیں کہتے ہیں جو اسلامی نہیں ہیں۔ ان حضرات کی خدمت میں عرض ہے کہ مولانا "کیسی" باتیں کہتے ہیں جو اسلامی نہیں ہیں اس کی حقیقت تو آپ کو عنقریب معلوم ہو جائے گی۔ البتہ یہ بات یقینی ہے کہ مولانا اسلام سے ہندوؤں کی وحشت کو ضرور دور کرنا چاہتے ہیں۔ ایسا کیوں چاہتے ہیں؟ اس کا ایک صاف جواب تو یہ ہے کہ ایک مولانا ہی کیا ہر مبلغ کو ایسا ہی کرنا چاہیے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ اور حضرت معاذ بن جبلؓ کو یمن تبلیغ کے لئے بھیجا تو آپ نے ان کو صاف صاف تاکید کر دی تھی کہ یَسِّرَا وَلَا تُعَسِّرَا وَبَشِّرَا وَلَا تُنَفِّرَا (صحیح بخاری) یعنی تم دونوں نرمی کرنا، سختی نہ کرنا۔ خوشخبری دینا، نفرت نہ دلانا۔

لیکن سوال یہ ہے کہ مولانا ہندوؤں پر ہی اس درجہ مہربان کیوں ہیں؟ دنیا میں آخر اور بھی غیر مسلم قومیں آباد ہیں؟ اس کی وجہ درحقیقت مولانا پر حضرت شاہ ولی اللہ کی تصنیفات و ملفوظات کا غیر معمولی اثر ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ نے اپنی کتاب فیوض الحرمین میں اشارۃً و کنایۃً اور تفہیمات الٰہیہ میں صراحۃً لکھا ہے کہ میرا اعتقاد ہے کہ اگر اقلیم ہندوستان پر ہندوؤں کا غلبہ عام اور مستقر ہو گیا تو اللہ کی حکمت میں یہ بات ضروری ہے کہ اللہ ہندوؤں کے بڑے بڑے لوگوں کو دین اسلام اختیار کر لینے کا الہام کرے۔[1]

مولانا نے دیکھا کہ ہندو ہر شعبہ میں ترقی کر رہے ہیں اور دفتری طاقت رفتہ رفتہ انھیں کے ہاتھوں میں منتقل ہو رہی ہے جیسا کہ ہر سیاسی مبصر جانتا ہے تو اب مولانا کے دل میں طبعی طور پر خواہش پیدا ہوئی کہ حضرت شاہ صاحب کے ارشاد کا دوسرا جز جو شرط کے لئے جزا کا حکم رکھتا ہے صادق

---

[1] تفہیمات الٰہیہ ج ۱ ص ۲۰۳۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آنا چاہئے۔ چنانچہ آپ نے اس کے لئے جدوجہد کی اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اگر حضرت شاہ صاحب کا یہ اعتقاد صحیح ثابت ہوا تو وہ یقیناً ایسے ہی مسلمان بزرگوں کی بدولت ہوگا جو ایک طرف ہندوؤں سے خلاملا رکھتے ہیں اور دوسری جانب وہ اسلامی اخلاق و فضائل۔ تقویٰ وطہارت اور پاکبازی و پاک باطنی کی ایسی زبردست روحانی طاقت کے مالک ہیں کہ بڑے سے بڑا کافر بھی انھیں دیکھکر خدا کو یاد کرنے لگتا ہے ورنہ محض الگ تھلگ رہنے اور دوسروں کا منہ چڑانے سے یہ مقصد کبھی حاصل نہیں ہو سکتا۔

جو دل قمارخانہ میں بت سے لگا چکے
وہ کعبتین چھوڑ کے کعبہ کو جا چکے

الزامِ کفر ہندوستانی قومیت کا مسئلہ تو خیر پھر بھی ایک سیاسی حیثیت رکھتا ہے۔ جناب ناقد نے ستم تو یہ کیا کہ مولانا پر الزام تراشی کفر سے بھی باز نہیں رہے۔ انھوں نے اگرچہ صاف طور پر مولانا کو کافر نہیں کہا لیکن غلط طور پر جو باتیں ان کی طرف منسوب کی ہیں ان کا حاصل اس کے سوا کوئی اور نہیں نکلتا کہ ان باتوں کے قائل کو کافر کہا جائے۔ مثلاً۔

"ہمارے مولانا تو دینِ حق کی برتری گویا مانتے ہی نہیں۔" [۱]

"وہ اسلام کا قلادہ بھی موجودہ انسان کی فلاح وبہبود کیلئے ضروری نہیں سمجھتے۔" [۲]

پھر اس ضد کا کیا ٹھکانا ہے کہ محض مولانا کی پرخاش میں جناب ناقد نے بعض ایسے حقائق کا انکار کر دیا ہے جو قرآن مجید کے مسلمہ حقائق ہیں۔ اور جن کو امت ہر قرن اور ہر زمانہ میں تسلیم کرتی آئی ہے۔ مثلاً وحدتِ انسانیت اور وحدتِ ادیان۔

وحدتِ انسانیت جنابِ ناقد کا ارشاد ہے۔

"قرآن مجید کے متعلق یہ کہنا صحیح نہیں کہ وہ مولانا کی وحدتِ انسانیت کا شارح ہے اور نہ وہ وحدتِ ادیان کا قائل ہے۔" [۳]

معلوم نہیں "مولانا کی وحدتِ انسانیت" سے لائق مقالہ نگار کی مراد کیا ہے کہ قرآن جس کا شارح نہیں ہے۔ "مولانا عبید اللہ سندھی" نامی کتاب کا باب "وحدتِ انسانیت" پڑھیے اور بتلایئے کہ اس میں مولانا نے جو کچھ فرمایا ہے کیا وہ قرآن کی تعلیم نہیں ہے؟

---

[۱] معارف ص ۱۶۳ - [۲] ر ۱۶۴ - [۳] ر ر ۱۶۳ -

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سرور صاحب لکھتے ہیں۔

"قرآن کے اصولوں پر خالص انسانیت کا قیام مولانا کا عقیدہ ہے، ان کے نزدیک خالص بے میل انسانیت ہی فطرۃ اللہ کی محافظ ہے اور سچا دین اگر ہے تو یہی ہے۔"

پھر لکھتے ہیں۔

"مولانا اپنے اس خیال کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک اسلام کی تعلیمات کا لب لباب قرآن مجید کی آیت "هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ" ہے۔"

اس باب کے ختم پر سرور صاحب وحدتِ انسانیت سے متعلق مولانا کے خیالات کا خلاصہ ان لفظوں میں بیان کرتے ہیں۔

اس بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ مولانا وحدتِ انسانیت کو مانتے ہیں اور قرآن مجید کو اسی وحدت کا شارح سمجھتے ہیں اور ان کے نزدیک قرآن کی تعلیمات کا مقصود یہی ہے کہ اس وحدت کا قیام عمل میں آئے اور لوگ عقیدۃً علماً و عملاً موحد بن جائیں۔ (ص ۱۴۱)

اب فرمایئے! اس میں کونسی بات قرآن مجید کے خلاف ہے۔ کیا قرآن مجید کے ارشاد وما ارسلناک الا کافۃ للناس اور ہم نے آپ کو تمام انسانوں کیلئے ہی بھیجا ہے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تمام دنیا کے لئے مبعوث ہوئے تھے اور آپ سے پہلے انسانیت جن مختلف گروہ بندیوں میں مبتلا تھی آپ ان تمام کو مٹا کر تمام انسانوں کو ایک خیال اور ایک ہی عمل کے رشتہ میں منسلک کرنے آئے تھے۔ اسی ایک خیال اور عمل پر کار بند ہو کر انسان موحد بنتا ہے اور قرآن مجید سب کا سب کیا اسی ایک نقطہ "توحید" کی شرح نہیں ہے یعنی وہ یہ نہیں بتاتا کہ وہ کونسا ایک بلند فکر، نظام، یا دستور ہے جس پر کار بند ہو کر تمام انسانیت ایک نقطہ وحدت پر جمع ہو جائے۔

گنجائش نہیں ورنہ قرآن پاک کی آیات بکثرت اسی مضمون کی پیش کی جا سکتی ہیں۔ اور مولانا کا مقصد وحدتِ انسانیت سے بجز اس کے کوئی اور نہیں ہے۔ کہ تمام انسان رنگ و نسل، ملک و وطن۔ اور اقلیم و قوم کے اختلاف کے باوجود صرف ایک فکر اور ایک نظام سے وابستہ ہو جائیں اور یہ فکر و نظام مولانا کے نزدیک بے شبہ وہی ہے جو قرآن کا فکر و نظام ہے جیسا کہ آپ نے متعدد مواقع پر اس کا صاف صاف اعتراف و ذکر کیا ہے۔ آئندہ اس کے حوالے آئیں گے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وحدتِ ادیان وحدتِ انسانیت کی طرح وحدتِ ادیان سے متعلق بھی یہ کہنا درست نہیں ہے کہ قرآن اس کا قائل نہیں۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ "ادیان" سے مولانا کی مراد وہ مذاہب ہیں جو اسلام سے قبل دنیا میں رائج تھے اور جن میں بنیادی طور پر خدا کو ایک مانا گیا ہے۔ ورنہ جیسا کہ بعض لوگوں کو شبہ ہے مولانا کمیونزم اور سوشلزم وغیرہ کو دین نہیں مانتے چنانچہ سرور صاحب "خدا پرستی" کے زیر عنوان مولانا کے افکار کا آغاز اس فقرہ سے کرتے ہیں۔ "مولانا کے نزدیک ساری آسمانی کتابیں اسی وحدتِ انسانیت کی ترجمان ہیں اور حقیقت شناس حکیم بھی اسی فکر کے ترجمان تھے" (ص ۴۲)

دیکھیے مولانا نے "دین" کے بارہ میں کوئی ابہام باقی نہیں رکھا بلکہ صاف صاف "آسمانی کتابوں" کا لفظ فرما کر یہ واضح کر دیا ہے کہ وہ ادیان سے مراد وہ مذاہب لیتے ہیں جو آسمانی کتابوں پر مبنی ہیں۔ رہ گئی یہ بات کہ "حقیقت شناس حکیم بھی اسی فکر کے ترجمان تھے" تو خود حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے بھی حکماء کا ایک ایسا طبقہ مانا ہے جو اپنی عقل و فراست، ریاضت و محنت، ترک لذاتِ دنیوی اور عالم جبروت کی طرف توجہ تام کے باعث اس سعادت کو حاصل کر لیتے ہیں جس کی اشاعت اور تبلیغ کے لئے انبیاء کرام مبعوث ہوئے ہیں۔ حضرت شاہ صاحب ان حکماء کو متالھون کا لقب دیتے ہیں اور اگرچہ ان کی تعداد بہت کم بتاتے ہیں تاہم ارشاد یہ ہے۔

فوصل بعضھم غایۃ مداھا[1] بعض بعض نے اس سعادت کا انتہائی مرتبہ حاصل کر لیا ہے۔

دین سے مولانا کی مراد کے واضح ہو جانے کے بعد اب پھر اس پر غور فرمائیے کہ کیا قرآن مجید اس بات کا داعی نہیں ہے کہ اصل دین تمام مذاہب اور ادیان میں مشترک رہا ہے۔ دنیا میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے مختلف قوموں اور ملکوں میں وقتاً فوقتاً جو رسول آتے رہے ان کے پیغامات بنیادی اعتبار سے بالکل ایک تھے۔ یعنی یہی کہ خدا کو ایک مانو۔ اس کی بندگی کرو، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ۔ اعمالِ صالحہ کرو، برے کاموں سے بچو، بے شبہ قرآن اس حقیقت کا داعی ہے وہ اپنے آپ کو اپنے سے پہلی کتب سماویہ کا مصدق بتاتا ہے۔ تمام انبیاء اور ان کی کتابوں پر ایمان لانے کی دعوت دیتا ہے۔ اس کا ارشاد ہے۔

شرع لکم من الدین ما وصّٰی بہ اس نے تمہارے لئے دین کی وہی راہ مقرر کی ہے

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ ص ۱۴۱۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نوحاً والذی اوحینا الیک وما وصینا	جس کی وصیت اس نے نوح کو اور ابراہیم ، موسیٰ
بہ ابراھیم وموسیٰ وعیسیٰ ان اقیموا	اور عیسیٰ (علیہم السلام) کو کی تھی یعنی یہ کہ تم دین
الدین ولا تتفرقوا فیہ۔	کو قائم کرو اور اس میں متفرق نہ ہو۔

ایک جگہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے کہتا ہے۔

وما ارسلنا من قبلک من رسول	اور (اے محمد) ہم نے آپ سے پہلے جتنے پیغمبر
الا نوحی الیہ انہ لا الہ الا انا	بھیجے ہیں ان کی طرف ہم نے یہی وحی کی ہے
فاعبدون۔	کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں پس میری ہی عبادت کرو۔

مزید برآں قرآن کہتا ہے کہ دینِ الٰہی کسی ملک یا خاندان یا کسی قوم کے ساتھ مخصوص نہیں ہے وہ اپنی اصل حقیقت میں ایک ہے اور سب کے لئے ہے۔ یہود اور نصاریٰ کو اسی بنا پر زجر و توبیخ کی گئی کہ وہ اہلِ کتاب ہونے اور کتبِ سماویہ کی تلاوت کرنے کے باوجود دینِ الٰہی کو اپنی ایک خاندانی یا جماعتی چیز سمجھ بیٹھے تھے اور دونوں ایک دوسرے کی تکذیب کرتے اور انھیں جھٹلاتے تھے۔

دین کی اس ایک اصل مشترک کے باوجود احکام و شرائع کے اعتبار سے یہ ادیان مختلف ضرور تھے لیکن یہ اختلاف منزلِ مقصود کا نہیں تھا بلکہ صرف ان راستوں کا اختلاف تھا جو منزلِ مقصود تک پہنچاتے ہیں۔ اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ احکام اور شرائع کا تعین ہر قدم کے مخصوص احوال ومشئون کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ قرآن حکیم میں ہے۔

لکل جعلنا منکم	ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لئے ایک
شرعۃ ومنہاجا۔	خاص طریقہ اور راستہ مقرر کر دیا ہے۔

مولانا عبید اللہ سندھی اسی حقیقت کو یعنی اصل دین میں اشتراک کو وحدت ادیان کہتے ہیں اور اس کا نام حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے اتباع میں فطرۃ اللہ رکھتے ہیں چنانچہ شاہ صاحب کا ارشاد ہے

فطرۃ فطر اللہ الناس علیہا	یہ ایک فطرت ہے جس پر اللہ نے لوگوں
ولن تجد لفطرۃ اللہ تبدیلا۔ و	کو مفطور کیا ہے اور تم اللہ کی فطرت
لیس ذالک الا فی اصول البر	میں تبدیلی نہیں پاؤگے اور یہ فطرت کی
والاثم وکلیاتھا دون فروعھا و	یکسانیت نیکی اور گناہ کے اصول و کلیات
حدودھا وھذہ الفطرۃ ھو	میں ہے۔ فروع و جزئیات میں نہیں اور
الدین الذی لا یختلف باختلاف	یہی فطرت وہ دین ہے جو زمانوں کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

الاعصار والانبیاء کلھم مجمعون علیہ۔ ؎۱ — اختلاف سے نہیں بدلتا اور تمام انبیاء اس پر متفق ہیں۔

اب حضرت شاہ صاحبؒ کی اس عبارت کے ساتھ مولانا سندھی کی مندرجۂ ذیل عبارت پڑھیے جو وحدتِ ادیان سے متعلق مولانا کے افکار کی غزل میں مقطع کا حکم رکھتی ہے اور دیکھیے کہ یہ عبارت کس طرح حضرت شاہ صاحب کے ارشاد کا ہی اردو ترجمہ معلوم ہوتی ہے۔ مولانا فرماتے ہیں۔

"تاریخ کا مطالعہ کرو اور پھر پتہ لگاؤ کہ آخر مجموعی انسانیت کا طبعی تقاضہ کیا ہے۔ انسان کن باتوں سے قعر تنزل میں گرے اور کون سے اصول تھے جن پر چل کر وہ بام رفعت پر پہنچے اس تلاش و تفحص کے بعد انسانوں کی اس طول طویل تاریخ میں جو اصول سب قوموں میں آپ کو مشترک نظر آئیں گے وہ فطرۃ اللہ ہے اور یہی الدین القیم ہے اور جو تعلیم مجموعی انسانیت کی فطرت کے مطابق ہوگی وہی حق ہے۔" (ص ۴۳)۔

علاوہ بریں حضرت شاہ صاحبؒ نے حجۃ اللہ البالغہ میں ایک مستقل باب باندھا ہے جس میں تمام ادیان کی اصل کے ایک ہونے اور شرائع و مناہج کے اختلاف پر نہایت مفصل اور حکیمانہ بحث کی ہے۔ اس میں قرآن مجید کی جو آیت شرع لکم من الدین الآیہ اوپر گذر چکی ہے اس کو نقل کر کے مشہور مفسر حضرت مجاہد کی تفسیر لکھتے ہیں۔

اوصیناک یا محمد وایاھم دیناً واحداً۔ — اے محمد ہم نے آپ کو اور ان پیغمبروں کو ایک ہی دین کی وصیت کی ہے۔

اس کے بعد چند اور آیات اور ان کی تفاسیر لکھی ہیں۔ پھر فرماتے ہیں۔

اعلموا ان اصل الدین واحد اتفق علیہ الانبیاء علیہم السلام وانما الاختلاف فی الشرائع والمناھج ؎۲ — جانو بے شبہ دین کی اصل ایک ہے۔ اس پر تمام انبیاء کا اتفاق ہے اور اختلاف صرف شرائع اور مناہج کا ہے۔

اسلام سب ادیان سے برتر ہے

یقین نہیں آتا کہ وحدتِ انسانیت اور وحدتِ ادیان ایسی اسلام کی عام اور مسلمہ حقیقت سے ندوۃ العلماء کا ایک ممتاز فاضل اس طرح بے خبر ہو یا باخبر ہونے کے باوجود کسی خاص وجہ سے اس کا انکار کر دے بہر حال۔

؎۱ حجۃ اللہ البالغہ ج ا ص ۲۰۔ ؎۲ ایضاً ج ا ص ۶۸۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ان کنت لا تدری فتلک مصیبۃ
وان کنت تدری فالمصیبۃ اعظم

ممکن ہے فاضل نقاد کو مولانا کے کسی فقرہ سے یہ دھوکا ہوا ہو کہ مولانا وحدتِ ادیان سے یہ مراد لیتے ہیں کہ دین دین سب برابر ہیں یہاں تک کہ اسلام کو بھی کسی دین پر برتری حاصل نہیں ہے اور اس بنا پر ایک شخص کو اختیار ہے کہ وہ جس دین کو چاہے اختیار کرے۔ چنانچہ اوپر "الزام کفر" کے زیر عنوان ہم نے موصوف کا جو فقرہ نقل کیا ہے اس سے یہی متبادر ہوتا ہے۔ اگر واقعہ یہی ہے تو واضح رہنا چاہیے کہ مولانا سندھی دین کی اصل ایک ماننے کے باوجود اسلام کو دنیا کا آخری دین برحق اور اس کی کتاب قرآن کو آخری آسمانی کتاب مانتے ہیں۔ ان کے نزدیک قرآن ان تمام صداقتوں کا کامل مجموعہ ہے جو اسلام سے پہلے مختلف ادیان میں بکھری پڑی تھیں۔ قرآن کا قانون تمام انسانوں کے لئے ہے اور انسانیت کی بھلائی کا راز صرف اسی کے اتباع اور پیروی میں ہے۔ سرور صاحب لکھتے ہیں

> "مولانا کے نزدیک قرآن نے تمام اقوام ادیان اور مذاہب کے مرکزی نکات کو جو کل انسانیت پر منطبق ہو سکتے ہیں یکجا کیا اور ساری دنیا کو یہ دعوت دی کہ صرف یہی ایک اساس ہے جس پر صحیح انسانیت کی تعمیر ہو سکتی ہے۔ اگر یہودیوں کی قوم میں اس انسانیت کا فقدان ہے تو وہ خواہ اپنے منہ سے "ابناء اللہ واحباءہٗ" بنیں گمراہ ہیں۔ اگر عیسائی اس سے خالی ہیں تو ان کا ابن اللہ کا ماننا کسی کام نہ آئے گا اور اگر ہندوؤں میں انسانیت کی کمی ہے تو ان کا پوتر ہونا محض خام خیالی ہے۔ (ص ۳۷)

غور کیجئے کیا اس عبارت سے یہ صاف معلوم نہیں ہوتا کہ مولانا تمام غیر مسلم قوموں کو انسانیت کے نام پر اسلام کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو جانے کی دعوت دے رہے ہیں صفحہ ۳۶ پر فرماتے ہیں۔

> "قرآن کا مقصود اصلی سب دینوں سے اعلیٰ دین۔ سب فکروں سے بلند تر فکر۔ یا سب سے بلند بین الاقوامی نظریہ جو زیادہ سے زیادہ انسانیت پر جامع ہو پیش کرنا اور اس پر عمل کرانا ہے۔"

قرآن کی عالمگیری اور لازوالی پر گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

> "قرآن انہی عالمگیر اور ناقابلِ تغیر اصولِ حیات کو پیش کرتا ہے۔ یہ قرآن کا صحیح مفہوم ہے اور یہی چیز ہے جو ازل سے ابد تک قائم رہیگی اور اسی کے ماننے میں تمام انسانوں کا بھلا ہے (ص ۴۴)۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مولانا اسلام کے پیغام کو تمام دنیا سے منوانے اور سارے جہان کو اسی ایک دین کا حلقہ بگوش بنانے کے لئے کس قدر بے چین ہیں اس کا اندازہ ذیل کی عبارت سے ہوگا۔ فرماتے ہیں۔

"ہر قوم کے عقلمند طبقوں کا رجحان اب اس طرف ہو رہا ہے اور وہ کوشش کر رہے ہیں کہ اپنے اپنے فکری نظاموں کو عالمگیر انسانیت کا ترجمان بنا کر پیش کریں۔ لیکن کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ وہ دین جو صحیح معنوں میں ساری انسانیت کا دین تھا اور وہ کتاب جو کل نوعِ انسانی کی ہدایت کی علمبردار تھی اور وہ ملت جس نے سب قوموں کو ایک بنایا اور جس کا تمدن ساری انسانیت کی باقیاتِ صالحات کا مرقع تھا۔ وہ دین وہ کتاب اور وہ ملت ایک فرقہ کی جاگیر بن گیا ہے اور وہ لوگ نہیں سمجھتے کہ اس وسعت پذیر دور میں جس میں کہ کرہ زمین کی سب دوریاں سکڑ گئی ہیں اور ملکوں، قوموں اور براعظموں کی سرحدیں مٹتی جا رہی ہیں۔ اور ریل جہاز، طیاروں، اور ریڈیو نے سب انسانوں کو اپنی کہنے اور دوسروں کی سننے کے لئے ایک انسانی برادری میں بدل دیا ہے۔ اس زمانہ میں ایسی تعلیم کو جو صحیح معنی میں عالمگیر اور انسانی تھی۔ ایک گروہ اور جماعت میں محدود کر دینا کتنا بڑا ظلم ہے۔ معلوم نہیں مسلمان اسلام کو کب سمجھینگے اور قرآن کے اصل پیغام کو کب اپنائینگے۔" (ص ۹۸)

قرآنی حکومت | لائق تبصرہ نگار کا دعویٰ ہے کہ

"مولانا دینِ حق کی دائمی برتری گویا مانتے ہی نہیں۔ ان کے نزدیک اب قرآنی حکومت کا زمانہ گذر گیا اور گذری ہوئی چیز واپس نہیں آسکتی۔"

اس دعوی کو ثابت کرنے کے لئے موصوف نے مولانا کی ایک عبارت نقل کی ہے جسے آپ بھی سن لیجئے۔

"جو زمانہ گذر گیا وہ پھر واپس نہیں آیا کرتا۔ جو پانی بہہ جاتا ہے وہ لوٹتا نہیں۔ قرآن پر عمل کر کے خلافتِ راشدہ کے دورِ اول میں صحابہ نے جو حکومت بنائی۔ اب بعینہ ویسی حکومت نہیں بن سکتی۔ جو لوگ قرآن کو اس طرح سمجھتے ہیں وہ حکمتِ قرآنی کے صحیح مفہوم کو نہیں جانتے۔ بیشک خلافتِ راشدہ کی حکومت قرآنی حکومت کا ایک نمونہ ہے لیکن یہ نمونہ بعینہ ہر دور میں منتقل نہیں ہو سکتا۔"

مولانا کی یہ عبارت من وعن آپ کے سامنے ہے۔ بتایئے اس کے کس لفظ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ "قرآنی حکومت" کا زمانہ گذر گیا۔ ہر بالغ عاقل سمجھ سکتا ہے کہ مولانا کا منشا یہ ہے کہ خلافتِ راشدہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بے شبہ قرآنی حکومت کا ایک نمونہ ہے (اور بے شبہ یہ ایسا نمونہ ہے جس کی نظیر تاریخِ عالم میں موجود نہیں ہے) لیکن یہ نمونہ بعینہ ہر دور میں منتقل نہیں ہو سکتا۔ یعنی خلافتِ راشدہ کے بعد تیرہ سو سال کی مدت میں مسلمانوں کی جو حکومتیں عالم کے مختلف گوشوں میں قائم ہوئیں۔ مولانا کے نزدیک وہ سب یا اُن میں سے اکثر بھی قرآنی حکومت کے طرز کی حکومتیں تھیں لیکن خلافتِ راشدہ نے قرآنی حکومت کا جو نمونہ پیش کیا وہ اپنی مثال آپ تھا۔ اس جیسی کوئی حکومت قائم نہیں ہو سکی۔ مسلمان عام طور پر اس کو اپنی بدنصیبی اور بدبختی سمجھتے ہیں۔ لیکن مولانا یہ فرماتے ہیں کہ یہ جو کچھ ہوا حکمتِ قرآنی کے ماتحت ہوا۔ یہ سمجھنا غلطی ہے کہ بس خلافتِ راشدہ ہی قرآنی حکومت کا نمونہ تھا۔ اس کے بعد اس حکومت کا دور بالکل ختم ہو گیا۔ نہیں بلکہ مولانا کو بنو امیہ، بنو عباس۔ مصر کے بنو فاطمہ، اندلس کے موحدین۔ سمرقند و بخارا کی دولت غزنویہ وغیرہ میں بھی قرآنی حکومت کا نمونہ نظر آتا ہے۔ اگرچہ یہ نمونہ خلافتِ راشدہ کے نمونہ سے کمتر ہے۔ مولانا کے نزدیک قرآنی حکومت کا زمانہ ختم نہیں ہوا۔ مسلمانوں کی گذشتہ طویل تاریخ میں کم و بیش قرآنی حکومت جلوہ فرما رہی ہے اور آج بھی ہو سکتی ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

"قرآن اب بھی اپنی حکومت قائم کر سکتا ہے لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ قرآن کو عقل اور تفقہ سے سمجھا جائے اور اس کی عالمگیریت کی کنہ معلوم کی جائے" (ص ۴۷)

یہاں اس بات پر متنبہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ آج کل پرجوش اور نوجوان مسلمانوں میں خود اپنی تاریخ سے ایک خاص قسم کی نفرت پیدا ہو رہی ہے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام کی عمر کل کچھ کم تیس برس ہے۔ خلافتِ راشدہ کے بعد دورِ ملوکیت شروع ہو گیا جو سراپا ظلم و ستم تھا۔ بادشاہ مطلق العنان اور مستبد ہوتے تھے۔ عیاش اور شہوت پرست ہوتے تھے۔ اسلام اور قرآن کا نام ہی نام رہ گیا تھا اور اسی بنا پر اکبر الہ آبادی نے "درحدیثِ دیگراں" "سرِ دلبراں" کا افشا اس طرح کیا تھا۔

"بوئے خون آتی ہے اس قوم کے افسانوں سے"

میں سمجھتا ہوں ہم نوجوانوں میں اس قسم کی ذہنیت کے پیدا ہونے کے دو سبب تھے ایک مستشرقین کا علمی رنگ میں ہماری روایات قومی کے خلاف زبردست پروپیگنڈہ۔ اور دوسرا خود ہمارے قدیم مورخین کا غیر محتاط طرزِ نگارش۔ بہر حال اسباب خواہ کچھ ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم میں خود اپنے اسلاف سے اور خصوصاً مسلمان سلاطین سے نفرت کا شدید جذبہ پیدا ہو گیا۔ اور ہم یہ یقین کر بیٹھے کہ خلافتِ راشدہ کے بعد دراصل قرآنی دستور، حدود اللہ، اسلامی آئینِ حیات سب کا سب معطل اور مفلوج و بیکار ہو گئے تھے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اب ذرا اور غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ اس ذہنیت کا ایک سبب اور ہے وہ یہ کہ ہم نے اسلامی اعمال ۔ فضائلِ اخلاق اور اسلامی مکارم و محاسن کا ایک ایسا اعلیٰ تخیل قائم کر رکھا ہے کہ ہم کو ان کا مصداق صرف حضرت ابوبکر و عمر اور حضرت عثمان و علی رضی اللہ عنہم کے کیرکٹر میں ہی نظر آتا ہے اور جب ان فضائل کا یہ اعلیٰ تصور ہم کو امیر معاویہ، عمرو بن العاص، مغیرہ بن شعبہ (رضی اللہ عنہم) اور عبدالملک بن مروان، ہشام اور ولید میں نظر نہیں آتا تو ہم ان بزرگوں پر تبرا شروع کر دیتے ہیں اور اپنے دلوں میں ان سے ایک قسم کی بیزاری محسوس کرتے ہیں ۔ حالانکہ ہم کو سمجھنا چاہئے کہ فضائل اخلاق میں سب انسان ایک ہی مرتبہ اور درجہ کے نہیں ہوتے ۔ باوجود "اچھا" ہونے کے باہم فرقِ مراتب ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ جس طرح کفر دون کفر ہوتا ہے اسی طرح ایمان میں بھی درجات کا تفاوت ناگزیر ہے حضرت امیر معاویہ کا کیرکٹر بے شبہ خلفاء راشدین ایسا نہیں تھا ۔ یا زیادہ صحیح یہ ہے کہ ان جیسا نہیں ہو سکا ۔ لیکن اس کے معنیٰ یہ نہیں ہیں کہ ان کی حکومت کو غیر قرآنی اور غیر اسلامی حکومت کہا جائے ۔ اس میں شبہ نہیں کہ امتدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کا اعتصام بحبل اللہ کمزور ہوتا چلا گیا ۔ لیکن یہ باور کرنا ایک کھلا ہوا فریب ہے کہ مسلمانوں نے اپنی سوا تیرہ سو سال کی تاریخ میں قرآنی حکومت کو بالکل بھلائے رکھا ۔ اور وہ اس سے بالکل کنارہ کش رہے ۔ بعض بعض سلاطین اپنے شخصی اعمال و افعال کے لحاظ سے خواہ کیسے ہی رہے ہوں لیکن اس کو بدلائلِ قاطعہ ثابت کیا جا سکتا ہے کہ مجموعی طور پر تاریخ کے ہر دور میں یہانتک کہ مغلوں اور دولتِ عثمانیہ کے آخری تاجداروں میں بھی مسلمان حکومتوں کا دستور العمل قرآن ہی رہا ہے ۔

پس مولانا عبید اللہ سندھی کی مذکورہ بالا عبارت دراصل آج کل کے "پرجوش" مسلمانوں کی اس غیر متوازن ذہنیت کے ہی خلاف ایک زبردست احتجاج ہے ۔ مولانا کی مراد یہ ہے کہ قرآنی حکومت کا ایک ایسا اعلیٰ تصور قائم کرنا کہ وہ اپنے مصداق کے لحاظ سے صرف خلافتِ راشدہ میں محدود ہو کر رہ جائے صحیح نہیں ۔ مولانا کے نزدیک قرآنی حکمت کا منشا یہ ہرگز نہیں ہے کہ مسلمان خلیفہ میں حضرت عمرؓ کی انتہائی سادگی پائی جائے تو اس کو تو قرآنی حکومت کا ایک نمونہ کہا جائے اور عجمیوں کی شوکت و حشمت کا توڑ کرنے اور ان پر اپنا رعب قائم کرنے کے لئے امیر معاویہ تزک و احتشام سے رہیں تو ان کے اس فعل کو غیر قرآنی کہا جائے ۔ مولانا کے نزدیک حکمتِ قرآنی کی رو سے حضرت عمرؓ اور حضرت معاویہؓ دونوں کا فعل "حکومتِ قرآنی" کا نمونہ ہے ۔ کیونکہ حضرت عمرؓ جس ماحول میں رہتے تھے اس کا تقاضا یہی تھا کہ اسلام کا خلیفہ ثانی اس طرح کی سادہ زندگی بسر کرکے اسلامی فضائل اخلاق کا ایک اعلیٰ نمونہ پیش کرے ۔ اور اس کے برخلاف حضرت امیر معاویہؓ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جس ماحول میں تھے اس کا مطالبہ یہ تھا کہ وہ شان و شوکت کے ذریعہ عجمیوں کے دلوں پر اسلامی حکومت کا رعب وداب قائم رکھیں۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ بعض تاریخوں کے بیان کے مطابق ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے امیر معاویہؓ سے ان کے رئیسانہ طرز بود و ماند سے متعلق سوال کیا اور امیر معاویہ نے جواب میں وہی بات کہی جو ہم اوپر لکھ چکے ہیں تو حضرت عمرؓ خاموش ہو گئے۔

بات طویل ہوتی جاتی ہے لیکن اتنا کہے بغیر آگے بڑھنے کو جی نہیں چاہتا کہ تمثیلاً آپ سلطان محمود غزنوی اور سلطان اورنگ زیب عالمگیر کے معاملہ پر غور کیجئے۔ ہمارا آج کل کا مسلمان نوجوان جو حکومتِ الہیہ کے تصور کے بادۂ سرجوش سے سرشار ہے وہ ان دونوں بادشاہوں کی زندگی کا ایک نہایت بھیانک اور افسوسناک خاکہ پیش کرتا ہے۔ چنانچہ مسلم یونیورسٹی کے صدر شعبۂ تاریخ پروفیسر محمد حبیب کی انگریزی کتاب "محمود آف غزنہ" ملاحظہ فرمائیے اس میں آپ دیکھیں گے کہ ایک غیر مسلم مورخ محمود غزنوی کی شان میں جو کچھ کہہ سکتا ہے وہ سب کچھ ہماری قومی درسگاہ کے مورخ نے اپنے زبانِ قلم سے بے تکلف کہہ ڈالا ہے۔ اور دیباچہ میں عذر یہ ہے کہ اسلام میں اصل چیز قرآن کا دستور ہے۔ اشخاص و افراد نہیں؟ لیکن محرم اسرار کن فکاں، حجۃ اللہ علی اہل الزماں حضرت شاہ ولی اللہ؎ اس نامور شخصیت کو کس نظر سے دیکھتے ہیں؟ اس کا اندازہ ان چند سطروں سے ہوگا جو آپ نے تفہیمات الہیہ جلد اول صفحہ ۲۴۶ پر اس شاہ بت شکن کی نسبت تحریر فرمائی ہیں، حضرت شاہ صاحبؒ کا جو میلانِ ذہنی سلطان غزنوی کے متعلق ہے۔ مولانا عبید اللہ سندھی دوسرے سلاطینِ اسلام کو بھی کم و بیش اسی نظر سے دیکھتے ہیں اور ان کا احترام کرتے ہیں۔

مولانا کا مطلب اسی سلسلہ کی ایک اور عبارت سے صاف ظاہر ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں۔

"قرآن کی تعلیم کا نتیجہ ایک زمانہ میں ایک خاص مظہر میں جلوہ گر ہوا۔ اب ضروری نہیں کہ دوسرے زمانہ میں وہ پھر بعینہ اسی صورت میں ظاہر ہو۔ صحابہ کے زمانہ میں تیر و کمان اور تلوار و ڈھال سے جہاد ہوتا تھا۔ اور مجاہدین اونٹوں اور گھوڑوں پر سوار ہو کر جہاد کو نکلتے تھے۔ اب قرآنی تعلیم نے اگر کبھی اپنے پیروؤں کو جہاد پر آمادہ کیا تو ضروری نہیں کہ پھر تلوار۔ ڈھال اور اونٹ اور گھوڑوں کی نوبت آئے اسی طرح خلافت راشدہ کے دور میں مساوات اور انصاف کا اصول ایک خاص نہج پر نافذ ہوا۔ اب زندگی بہت کچھ بدل گئی ہے اور اس کے ساتھ زندگی کی ضرورتیں بھی بدل گئی ہیں۔ اس لئے مساوات اور انصاف کا حلقۂ اثر بھی بہت وسیع ہوگا یعنی مقاصد تو وہی رہیں گے۔ لیکن

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ان کی عملی شکل حالات واسباب کی تبدیلی کی وجہ سے پہلی سی نہ ہوگی۔" (ص ۴۷)

مولانا عملی شکل کی جو تبدیلی چاہتے ہیں اس سے مراد یہ نہیں ہے کہ حلال کو حرام اور حرام کو حلال کرلیا جائے بلکہ جیسا کہ ان کی تمثیل سے صاف ظاہر ہے اس کا منشا یہ ہے کہ فقہاء جہاں جہاں گنجائش دیکھیں وہ اصول تشریع و تقنین کی روشنی میں تبدیلی کرلیں۔ مثلاً غلام بنانا عہدِ فاروقی میں مباح تھا لیکن اب بین الاقوامی حالات کی وجہ سے اگر مسلمانوں کا امام اس کو بند کردے تو یہ جائز ہوگا اور نہ صرف یہ کہ جائز ہوگا بلکہ اسے ایسا کرنا ہی چاہیئے۔ اسی طرح خلافتِ راشدہ میں مسلمانوں کے دوسری قوموں سے سیاسی اور تجارتی تعلقات و روابط اس زمانہ کے حالات و مقتضیات کی بنا پر خاص خاص اصول و آئین پر مبنی تھے۔ لیکن آج چونکہ حالات دوسرے ہیں اس لئے مسلمانوں کو از سرِ نو غور کرنا ہوگا کہ وہ دنیا کی دوسری قوموں کے ساتھ اس نوع کے روابط قرآن و سنت کی روشنی میں کس طرح قائم رکھ سکتے ہیں۔ اور اس کے دفعات و شرائط کیا ہونگے؟ مولانا سندھی کے نزدیک عہد خلفاء راشدین میں جو کچھ ہوا وہ جس طرح قرآنی دستور پر عمل کا ایک نمونہ تھا۔ اسی طرح مسلمان زمانہ کے دگرگوں حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اب جو کچھ کریں گے وہ بھی قرآنی دستور و آئین کا ہی ایک نمونہ ہوگا۔ نہ کہ اس کا غیر! مولانا نے یہ خیال ظاہر کرکے کوئی نئی بات نہیں فرمائی۔ بلکہ وہی بات کہی ہے جسے عام طور پر آج کل ہمارے روشن خیال علماء "فقہ کی جدید تدوین و ترتیب" کے زیرِ عنوان اکثر کہتے رہتے ہیں۔

آپ نے دیکھا مولانا کا مقصد کیا ہے؟ کس درجہ حقیقت افروز اور دل لگتی بات کہی ہے اور تاریخ اسلام کے حکومتی ادوار کا کتنا اچھا اور پاکیزہ تصور پیش کیا ہے۔ لیکن جناب ناقد کو ان عبارتوں میں مولانا کی کفر سامانی کا عفریت جان شکار اپنی بھیانک شکل میں نظر آرہا ہے اور وہ ان کا مفہوم یہ متعین کرتے ہیں کہ مولانا دین حق کی برتری کے قائل ہی نہیں اور ان کے نزدیک قرآنی حکومت کا زمانہ گذر گیا۔

بہ بیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بکجا

اقبال نے غالباً اسی قسم کے سخن فہمان عالمِ بالا کی نسبت کہا ہے اور ٹھیک کہا ہے۔

باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری
اے کشتۂ سلطانی و ملائی و پیری

جناب ناقد کو مولانا سندھی کی اس دعوتِ تجدید و اصلاح میں دینِ حق کی برتری سے انکار کا سامان نظر آتا ہے۔ لیکن شاید انھیں خبر نہیں ہے کہ ان کے عارفِ لاہوری اور ہمارے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حکیم شرق ڈاکٹر اقبال مرحوم نے اپنے انگریزی زبان کے چھٹے لکچر میں (جس کا عنوان ہے۔
"The principle of movement in the structure of Islam"
جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ سندھی غریب کے افکار سے بھی زیادہ شدت رکھتے ہیں۔ یہ لکچر انگریزی میں ہے اور اردو میں اب تک اس کا ترجمہ نہیں ہوا۔

ناقد صاحب سے گذارش ہے کہ اگر اب تک یہ لکچر آپ کی نظر سے نہیں گذرا ہے تو اب دیکھ لیں اور پھر فرمائیں کہ جب حضرت شیخ الہندؒ کے معنوی لختِ جگر کی نسبت جناب کا وہ فتویٰ ہے تو اب اسلامیانِ ہند کے شاعرِ حکیم کے متعلق کیا حکم ہے؟

• بڑا مزہ ہو جو محشر میں ہم کریں شکوہ　　وہ منتوں سے کہیں چپ رہو خدا کیلئے

اس کتاب کے بعض حوالے آگے آئیں گے۔

ممکن ہے بعض لوگوں کو مولانا سندھی کا یہ فقرہ اکھرے کہ "یہ نمونہ بعینہٖ ہر دور میں منتقل نہیں ہو سکتا" یعنی خلافتِ راشدہ ایسی حکومت جو قرآنی دستور کا اعلیٰ نمونہ ہو اب قائم نہیں ہو سکتی۔ لیکن ان حضرات کو یقین کرنا چاہئے کہ کوئی حقیقت خواہ کتنی ہی تلخ اور ناگوار ہو بہر حال حقیقت ہے اور اسے تسلیم کرنا ہی چاہئے۔ اگر یہ واقعہ ہے کہ حضرت ابو بکرؓ و عمرؓ ایسے خلفاء اور حضرت سعد بن وقاص، ابو موسیٰ اشعری، مغیرہ بن شعبہ اور خالد بن ولید رضی اللہ عنہم جیسے عمال وولاۃ اور صحابۂ کرام و تابعین عظام جیسی رعایا جو مشکوٰۃ نبوت سے براہِ راست یا ایک واسطہ سے مستنیر ہو رہے تھے ایک مرتبہ پیدا ہونے کے بعد پھر پیدا نہیں ہوئے اور نہ اب آئندہ پیدا ہوں تو ہمیں باور کرنا چاہئے کہ خلافتِ راشدہ ایسے طرز کی قرآنی حکومت بھی اب کبھی قائم نہیں ہو سکتی۔ اگر ایسا ممکن ہوتا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کیوں فرماتے کہ میرے بعد خلافت تیس سال ہو گی اور اس کے بعد ملکِ عضوض کا دور دورہ شروع ہو جائے گا۔

خلافتِ راشدہ کے بعد سے اب تک کی پوری تاریخ اسلام گواہ ہے کہ اس مدت میں وقتاً فوقتاً خلافتِ راشدہ کے طرز کی حکومتیں قائم کرنے کی کیسی عظیم الشان اور مخلصانہ کوششیں ہوئی ہیں مگر ان کا انجام کیا ہوا۔ دور کیوں جائیے! پہلی صدی ہجری کے ختم پر ہی حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے اس سلسلہ میں کیا کچھ نہیں کیا لیکن ارباب خبر جانتے ہیں کہ خود ان کے گھر اور خاندان والوں نے ان کی مخالفت میں کیا کمی کی۔ اور آخر کار دو سال کی خلافت کے بعد ہی انھیں مسموم ہو کر جامِ شہادت نوش کرنا پڑا پس جو چیز خیر القرون میں نہ ہو سکی وہ اب دورِ پرفتن میں کیونکر ہو سکتی ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

رسوم | فاضل ناقد کو مولانا کے متعلق جو مغالطہ خلافتِ راشدہ والی مذکورہ بالا عبارت سے ہوا۔ اسی قسم کا مغالطہ ایک اور عبارت سے ہوا ہے جس سے انھوں نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ مولانا شاید اسلام کا قلادہ بھی موجودہ انسان کی فلاح و بہبود کے لئے ضروری نہیں سمجھتے وہ عبارت یہ ہے۔

"میں دین کو اسی بنا پر انسانیت کے لئے ضروری سمجھتا ہوں کہ اس پر چلنے سے ہر فردِ انسان کی انانیت بیدار ہوتی ہے۔ بدقسمتی سے لوگوں نے خاص اپنے خاندان یا صرف اپنے ملک کے خاص اور محدود مذہب کو دینِ حق مان لیا اور جو ظاہری طور طریقوں میں ان سے مختلف ہوا اس کو کافر قرار دیا اور یہ نہ دیکھا کہ دین کا جو مقصود حقیقی ہے وہ ان کے ہاتھ آتا بھی ہے یا نہیں۔"

جناب ناقد اس عبارت کو نقل کر کے لکھتے ہیں۔

"جانے ظاہری طور طریقوں سے مولانا کی مراد کیا ہے؟ کیا نماز پڑھنا، روزے رکھنا، زکوٰۃ کی ادائی، حج ادا کرنا، یہ سب طور طریقے ہیں اور جو ان کا قائل نہ ہو وہ رب العالمین کی بارگاہ میں مقبول ہو سکتا ہے؟ اور پھر ہمیں بتایا جائے کہ محدود مذہب سے مراد کیا ہے کیا اسلامی شریعت بھی اسی محدود مذہب کی فہرست میں داخل ہے؟ (معارف ص ۱۰۲)

اصل مسئلہ پر بحث کرنے سے پہلے یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ مولانا جب اسلام کے بارہ میں غیر مسلموں سے گفتگو کرتے تھے تو ان کا اس معاملہ میں ایک خاص اصول تھا۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ عصر جدید کا ذہن مذہب کو ان پرانے طریقوں سے سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتا جن کے ذریعہ پہلے زمانہ میں مذہب کی حقیقت سمجھائی جاتی تھی۔ مثلاً اگر آج یورپ کے سائنس زدہ کسی آدمی کے سامنے مذہبی اور اخلاقی اقدار کا ذکر کر کے یوم آخرت کا تذکرہ کریں تو اس کا ذہن اس کے قبول کرنے سے انکار کر دیگا اس کے برعکس وہ آج مذہب کو ایک انسانی نظام کی حیثیت سے سمجھنا چاہتا ہے یعنی اگر کوئی مذہب سچا ہے تو وہ انسانوں کی موجودہ زندگی کو بہتر بنانے کے لئے کیا کچھ کر سکتا ہے اس مذہب کا پابند ہو کر ایک قوم کے تعلقات دوسری قوموں کے ساتھ کیسے ہوں گے؟ ان کی معاشی اور اقتصادی حالت کیا ہوگی؟ زندگی کے متعلق ان کا نقطۂ نظر کیا ہوگا؟ اس بنا پر مولانا فرماتے تھے کہ جب تم کسی غیر مسلم سے گفتگو کرو تو بالکل غیر جانبدار ہو کر کرو۔ یعنی اس طرح کہ گویا دو غیر مسلم آپس میں گفتگو کر رہے ہیں اور پھر اسلام کو بحیثیت ایک اعلیٰ ترین فکر و نظام کے پیش کرو تو تم دیکھو گے کہ اس کے دو نتیجے ہوں گے ایک تو یہ کہ وہ تمہاری باتوں کو عالی حوصلگی اور وسعتِ قلب کے ساتھ سنیگا۔ اور دوسرا یہ کہ جب

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس پر اسلام کی حقیقت بحیثیت ایک اعلیٰ، مکمل اور ہر جہت تمام نظام کے روشن ہو جائے گی اور اس کو یہ یقین ہو جائیگا کہ اسی نظام سے وابستہ ہو کر دنیا کے لوگ امن وچین اور خوشحالی کی زندگی بسر کر سکتے ہیں تو وہ فوراً اس کو قبول کر لیگا اور اس نظام وفکر کی حقیقی عظمت اس کے دل میں پیدا ہو جائے گی۔ اس کے بعد تمہارے علیٰ موقع ہے کہ تم اسلام کی دوسری تعلیمات سے اس کو آشنا کر دو۔ یہی وجہ ہے کہ چونکہ مولانا کا اصل مشن اسلام کو حقیقۃً عالمگیر بنانا اور دنیا کی تمام قوموں کو اس کا حلقہ بگوش کرنا ہے اسلئے وہ ہمیشہ اصولی اور بنیادی امور پر گفتگو کرتے ہیں۔ مسائل جزیہ، یا رسوم شرعیہ کا ذکر نہیں کرتے۔ ورنہ جو شخص خود رسوم کا اس قدر پابند ہو کہ نماز باجماعت کو ترک نہ کرے، تہجد تک کی نماز بالالتزام ادا کرے اوراد و وظائف کا پابند ہو، روزہ سفر میں بھی نہ قضا ہونے دیتا ہو، حج کئی ایک کئے ہوں، قیام حجاز کے زمانہ میں کثرتِ طواف میں اس کو لطف وسرور ملتا ہو۔ اس کی نسبت یہ باور کرنا کہ وہ رسوم کو ظاہری طور طریق سمجھکر غیر اہم قرار دیتا ہے کیونکر قرینِ صواب ہو سکتا ہے؟

یہاں یہ بھی واضح رہنا چاہئے کہ بظاہر عبادات اور شعائر دینیہ کے لئے رسوم کا لفظ نامناسب معلوم ہوتا ہے لیکن اصل یہ ہے کہ یہ اصطلاح خود مولانا کی اپنی نہیں ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ نے حجۃ اللہ البالغہ اور تفہیمات میں اس لفظ کو اسی معنیٰ میں متعدد مواقع پر استعمال کیا ہے؟

اب سنئے! رسوم کے متعلق مولانا کا کیا خیال ہے: اس سلسلہ میں لائق تبصرہ نگار کا یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ مولانا رسوم کو لازمی اور ضروری قرار نہیں دیتے۔ مولانا فرماتے ہیں۔

"امام ولی اللہ تمام شرائع الٰہیہ کے اندر رسوم کو مرکز مانتے ہیں۔ قرآن عظیم نے اس کو معروف کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ (ص ۳۹)۔

ایک جگہ ان کا ارشاد ہے۔

"زندگی جب اس دنیا میں اسباب وحالات کا جامہ پہنتی ہے تو اسے ممکن اور موجود ہونے کے لئے لامحالہ رسوم اختیار کرنی پڑتی ہیں۔ ان رسوم کے بغیر زندگی زمان ومکان کے دائرہ میں وجود پذیر نہیں ہو سکتی۔" (ص ۳۸)

لیکن مولانا کا منشا یہ ہے کہ "رسوم کو رسوم ہی سمجھا جائے۔ لباس لباس ہی رہے۔ اسے صاحبِ لباس نہ مان لیا جائے۔" (ص ۳۸) اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مولانا مذہب کی اصل روح اور رسوم ان دونوں میں فرق کرتے ہیں۔ مذہب کی غرض وغایت مولانا کے لفظوں میں یہ ہے کہ انسان کی انانیت بیدار ہو۔ اس "انانیت" کے لفظ سے دھوکہ نہیں کھانا چاہئے۔ مولانا خود اس کی تشریح ایک

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور جگہ اس طرح کرتے ہیں۔

"جب انسان میں یہ باطنی شعور بیدار ہو جاتا ہے تو وہ اس وقت یہ محسوس کرتا ہے کہ یہ "انا" کسی اور وجود برتر کا پرتو ہے، یا یہ "انسانی انا" کسی بڑے "انا" کا فیضان ہے، یہ ہے انسان کا شعور خداوند تعالیٰ کے وجود کا، سکندر نامہ میں نظامی نے اس حقیقت کو یوں پیش کیا ہے "توئی آنکہ تا من منم با منی" (ص ۱۰۱)

مذہب کی اصطلاح میں مولانا کی اس عبارت کا مطلب یہ ہوا کہ مذہب کا مقصد انسان کا رشتہ خدا سے جوڑنا اور ایک ماورا ہستی کا تصور اس کے ذہن و دماغ میں پیدا کرنا ہے۔"

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس رشتہ کے حقوق و فرائض کیا ہیں؟ اور اللہ کا تقرب کس طرح حاصل ہو سکتا ہے؟ تو مذہب اس سوال کے جواب میں رسوم کی تعیین کرتا ہے۔ جن کو مولانا لازمی اور ضروری قرار دیتے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی وہ اس حقیقت پر متنبہ کرنا چاہتے ہیں کہ رسوم محض ذرائع اور وسائل ہیں۔ اصل مقصود و مطلوب تقرب الی اللہ ہے جو مذہب کی روح اور بنیادی حقیقت ہے دونوں کی اس حیثیت کو فراموش نہ کرنا چاہئے ورنہ اگر خلط مبحث کر دیا جائیگا تو نتیجہ گمراہی اور فوتِ مقصد کے سوا کچھ اور نہ ہوگا۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

"لیکن جب لباس ہی پر زور دیا جائے اور رسوم ہی اصل مذہب کا درجہ حاصل کر لیں اور اکثریت قبلہ کو قبلہ نما سمجھنے سے عاری ہو جائے تو پھر یہ رسوم بت بن جاتے ہیں" (ص ۳۸)

مولانا نے یہ جو کچھ کہا کوئی عجوبہ اور انوکھی بات نہیں ہے۔ آج ہر شخص اس کا مشاہدہ کر سکتا ہے کہ ہم میں کتنے ہیں جو نماز پڑھتے، روزہ رکھتے ہیں اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور حج بھی کر آتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ان کی یہ عبادتیں مذہب کی اصل روح سے خالی ہونے کے باعث ان کے لئے فحشاء اور منکر سے باز رہنے کا سبب ثابت نہیں ہوتیں۔ ان کے نزدیک اصل دین ہی رسوم ہیں۔ اور انھیں کے بجا لانے پر انھوں نے نجاتِ اخروی کا دارومدار سمجھ رکھا ہے وہ نماز پڑھتے ہیں اور ساتھ ہی بدکاری اور شراب خوری کا بھی شغل مستمر رکھتے ہیں۔ زکوٰۃ ہر سال پابندی سے ادا کرتے ہیں۔ لیکن سودی کاروبار اور حرام تجارت کرتے ہوئے بھی شرم محسوس نہیں کرتے۔ حج کو جاتے ہیں لیکن حج کے بعد اپنے آپ کو تمام گناہوں سے سبکدوش تصور کر لینے کے باعث ان کو کسی گناہ کبیرہ کے ارتکاب میں ذرا تامل بھی نہیں ہوتا۔ بقرعید پر بجائے ایک کے دس دس قربانیاں کرتے ہیں لیکن اللہ کے راستہ میں ایک انگلی شہید کرانے کے حوصلہ سے بھی یکسر محروم ہوتے ہیں۔ عبادات کر کر کے اللہ کی توحید کا زبان سے اقرار کرتے ہیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لیکن اِن کے دلوں میں حرص وطمع، خود غرضی، زر پرستی، جاہ پسندی کے ہزاروں بتکدے آباد ہیں۔ غیر اللہ کے احکام وقوانین کی پوجا کرتے ہیں۔ چند قرصہائے سیم وزر کے لئے امیروں اور رئیسوں کے دروازوں پر جبہ سائی کرتے ہیں۔ اوران کو امر بالمعروف ونہی عن المنکر کرنے کے بجائے ان کی شان میں مدحیہ قصائد پڑھتے ہیں اور نہیں جانتے کہ اس طرح وہ اللہ کے حقوق کو کس بیدردی سے پامال کررہے ہیں رسمی اور ظاہری طور پر نماز روزہ کی پابندی کرنے کے باوجود نہ ان کا دل مسلمان ہوتا ہے اور نہ ان کی روح مذہب کی اصل حقیقت سے آشنا ہوتی ہے ان کے اخلاق خراب ہوتے ہیں۔ معاملات میں دیانت اور راست بازی سے ان کا دور کا بھی کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ وہ زبان سے چاہے نہ کہیں مگر ان کا اندرونی جذبہ یہی ہوتا ہے کہ اگر محرمات کے ارتکاب، فواحش ومنکرات پر اصرار اور رذائل اخلاق میں انہماک کے ساتھ ساتھ وہ نماز روزہ بھی کرتے رہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ۔

رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی

کسی خاص طبقہ اور گروہ کی خصوصیت نہیں۔ آج ہر طبقہ اور ہر گروہ میں اس کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ تاجر عیاش اور شرابخور ہونے کے باوجود زکوٰۃ بھی ادا کررہا ہے۔ سرکاری افسر نماز روزہ کی پابندی کے ساتھ غیر اللہ کو اپنا خدا بھی بنائے ہوئے ہے۔ صوفی وجد ومراقبہ اور ذکر وحال کے ساتھ اعلائے کلمۃ اللہ کے جذبہ سے بالکل محروم ہے۔ مولوی قال اللہ اور قال الرسول کے ورد کے باوجود حقوق العباد اور اسلامی جرأت وبیباکی اور ایک مومن کی پاک نظری سے کوئی سروکار نہیں رکھتا۔ تو کیا یہ سب اللہ اور اس کے رسول کے مجرم نہیں ہیں۔ کیا انھوں نے خدا کو چھوڑ کر رسوم کو پوجنا شروع نہیں کردیا ہے۔ کیا یہ اصل دین کے مقصد بلند سے بے بہرہ اور محروم ونا آشنا نہیں ہیں۔ دین کا اصل مقصد تھا تزکیۂ نفس اور تصفیۂ باطن۔ پھر اگر یہ نمازیں اور یہ روزے ہی اصل دین ہیں جو محض رسمًا ادا کرلئے جائیں تو یہ تزکیہ کیوں نہیں ہوتا۔ دلوں پر کفر وشرک اور اعمالِ سیئہ کا تو بر تو زنگ کیوں چڑھا ہوا ہے۔ اور یہ ظاہر وباطن کی خلافت کا سزاوار مسلمان کیوں شعلہ ہونے کے باوجود خس وخاشاک کی غلامی پر قناعت کرکے بیٹھ گیا ہے۔ اگر محض رسوم کی پابندی حزب اللہ میں داخل ہونے کے لئے کافی اور وافی ہے تو اللہ کے وعدہ کے مطابق آج اس بدنصیب قوم پر فلاح کے دروازے کیوں نہیں کھلتے اور " انتم الاعلون " کا تاج اس کے سر پر کیوں نہیں رکھا جاتا۔ آخر یہ کیا قہر ہے کہ آج وراثت ارضی کے سچے مستحق کے لئے شہرستانِ امن وعافیت میں ایک انچ زمین بھی باقی نہیں رہی۔ حکومتِ ربانی کے علمبردار اور خازر زرِ دولت ونکبت میں یوں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وقفِ آلام و مصائب ہو کر جبین خیر الامم کے طغرائے امتیاز سے سرفراز اور اس طرح زاغ و زغن ظلم وستم کے پنجوں میں گرفتار ہوں۔

فآھا ثمّ آھا ثمّ آھا

اسے کون باور کریگا کہ کوئی محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کا غلام ہو اور پھر اس کا حال یہ ہو

بریشم قبا خواجہ از محنتِ او
نصیبِ تنش جامۂ تار تارے

تو پھر کیا اس کے صاف معنیٰ یہ نہیں ہیں کہ ہم نمازیں پڑھتے ہیں مگر درحقیقت وہ نمازیں نہیں ہیں۔ روزہ رکھتے ہیں مگر دراصل وہ فاقہ ہیں روزہ نہیں۔ اور کیا یہ نمازیں اور یہ نمائشی روزے اس قابل نہیں کہ ان میں روح پیدا کر کے انھیں سچی نمازوں اور حقیقی روزوں کی شکل میں منتقل کیا جائے جن میں مذہب کی اصل روح کارفرما ہو اور جن پر وہ نتائج مرتب ہوں جو ان پر مرتب ہونے چاہئیں۔ پس یہ ہے مولانا کا اصل مطلب اور یہ ہے ان کی حقیقی مراد۔ چنانچہ فرماتے۔

"بے شک رسوم قابلِ احترام ہیں لیکن اس وقت تک جب تک وہ حقیقت اور حکمت سے بہرہ ور رہتی ہیں۔ لیکن جب رسوم کھوکھلی ہو جائیں اور ان کے اندر صحیح روح باقی نہ رہے تو پھر ان کا وجود و عدم برابر ہوتا ہے۔" (ص ۳۹)

صوفیارِ کرام کے نزدیک جو نماز حضورِ قلب کے ساتھ ادا نہ ہو وہ نماز ہی نہیں ہے تو اگر مولانا نے یہ فرمادیا کہ جو نماز محض رسماً اور نمود و نمائش یا خود فریبی کے جذبہ کو تسکین دینے کے لئے ادا کی جائے وہ درحقیقت نماز نہیں تو فرمائیے کیا قصور کیا!

اس موقع پر اس بات کا ذکر کر دینا بھی ضروری ہے کہ ہم نے خود مولانا کی زبان سے مذہب و رسوم کے فرق پر جو تقریر سنی ہے۔ اوپر کا بیان اسی کی روشنی میں ہے۔ یہ کہنے کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ ہمارے خیال میں اس موقع پر سرور صاحب کے بیان میں غلطی ہوئی ہے۔ انھوں نے ترکِ رسوم کے ساتھ وحدتِ انسانیت کا جوڑ لگا کر اصل مسئلہ کو مغالطہ انگیز بنا دیا ہے۔ حالانکہ یہ دونوں چیزیں بالکل الگ الگ ہیں۔ ہم اپنے یقین کی بنا پر کہتے ہیں کہ مولانا رسوم کے بالکل ترک کے قطعاً قائل نہیں ہیں۔ بلکہ وہ غیر ذی روح کی جگہ ذی روح اور نمائشی رسوم کی جگہ حقیقی رسوم چاہتے ہیں۔ چنانچہ ان کا یہ فقرہ "ان کا بدلنا اور ان کی تجدید لازمی ہو جاتی ہے۔" بھی اسی پر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دلالت کرتا ہے۔ کیونکہ تجدید میں اصل شے فنا نہیں ہوتی بلکہ متعدد اسباب سے اس کے اصل رُخ پر جو اوہام و ظنون کا گرد و غبار پڑ جاتا ہے اس سے اس کو صاف اور منقح کر دیا جاتا ہے۔

محدود مذہب فاضل ناقد پوچھتے ہیں کہ مولانا کی عبارت میں محدود مذہب سے کیا مراد ہے؟ کیا اسلامی شریعت بھی اسی محدود مذہب کی فہرست میں داخل ہے" ؟ جواباً عرض یہ ہے کہ محدود مذہب سے مولانا کی مراد اسلامی شریعت نہیں ہے اور نہ کبھی ہو سکتی ہے۔ بلکہ وہ فقہی مذاہب مراد ہیں جو اسلامی شریعت کی ہی شرح کا حکم رکھتے ہیں۔ مولانا فرماتے ہیں۔

"بد قسمتی سے لوگوں نے اپنے خاندان یا صرف اپنے ملک کے خاص اور محدود مذہب کو دینِ حق مان لیا اور جو ظاہری طور طریقوں میں ان سے مختلف ہوا اس کو کافر قرار دیا۔ (ص ۴۷۱)

ممکن ہے کسی کو اس پر تعجب ہو۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ جو لوگ کسی ایک امام کی تقلید میں حد درجہ غالی ہوتے ہیں وہ اپنے امام کے مقلدین کے سوا دوسروں کو مسلمان بھی مشکل سے ہی باور کر سکتے ہیں۔ اب تو خیر یہ چیز کم ہو گئی ورنہ گذشتہ زمانہ میں خود ہندوستان میں ہی مقلدوں اور غیر مقلدوں میں جو جنگ برپا رہتی تھی وہ ہر شخص کو معلوم ہے۔ یا ایک زمانہ میں مصر میں حنفیوں اور شافعیوں میں جو اکھاڑہ بازی ہوئی ہے اس سے اربابِ علم باخبر ہیں۔ آج بھی آپ سرحد کے بعض علاقوں میں جا کر دیکھئے کہ شامی یا ایک اور کتاب کے علاوہ ناممکن ہے کہ آپ ان کے سامنے فقہ کی کسی اور کتاب کا نام بھی لے سکیں۔ مولانا اس ذہنیت کے برخلاف زبردست احتجاج کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ اسلام عالمگیر مذہب ہے وہ کسی ایک فقہی مسلک (یا مذہب) میں محدود نہیں ہے۔ کسی ایک فقہی مذہب کی پیروی کی وجہ سے ظاہری طور طریقوں میں بعض لوگوں کو دوسرے لوگوں سے جو امتیاز پیدا ہو جاتا ہے اس کی بنا پر اپنے آپ کو دینِ حق پر سمجھنا اور دوسرے فقہی مذہب کے پیرووں کو کافر قرار دینا سراسر گمراہی ہے۔ خود میرے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا ہے کہ مسجدِ حرام میں بعض ہندوستانیوں نے مالکی مذہب کے لوگوں کو ہاتھ چھوڑ کر نماز پڑھتے دیکھا تو انھوں نے مجھ سے پوچھا کہ یہ کون لوگ ہیں؟ میں نے کہا "مالکی" وہ بولے "تو کیا یہ بھی مسلمان ہیں"؟ میں نے کہا "شاید آپ لوگوں سے زیادہ پکے" اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ کس طرح ایک ملک کے لوگ اپنے ہی محدود مذہب کے ظاہری طور طریقوں کو عین اسلام سمجھتے ہیں۔ مولانا اسی پر متنبہ کر رہے ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ نے حجۃ اللہ البالغہ میں فقہاء کے اسباب اختلاف پر بحث کرتے ہوئے آخر میں فقہی مذاہب کے پیرووں کے باہمی جدل و نزاع اور تقلیدِ جامد کے مضرات پر

© rasailojaraid.com